R. N. 2186(5)

Regd. No. A. [illegible]

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

Telephone No. 40

Telegrams: "ANJUMAN"

ہماری زبان

[illegible]

جلد ۲۱ - شمارہ ۳۱	ایڈیٹر - آل احمد سرور	علی گڑھ - ۱۵ راگست ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

سلونو کی تہذیبی اہمیت

ہمارے ہاں تہواروں کو مذہب کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر عامی ابھی تہواروں کو مذہبی حیثیت سے مناتے ہیں۔ حالانکہ سب تہوار مذہبی نہیں ہوتے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی مذہب کے لوگوں میں علاقے اور خطے کے فرق سے مختلف تہوار رائج ہو جاتے ہیں یا ایک ہی تہوار مختلف طور پر منایا جاتا ہے۔ چنانچہ ضروری نہیں کہ ہر تہوار مذہبی ہو۔ بہت سے تہوار ملک کے جغرافیائی اور سماجی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آتے ہیں۔ تہوار دراصل خوشی کے جذبات کا وہ اظہار ہیں جو اجتماعی طور پر کیا جائے۔ لیکن قدیم زمانے میں چونکہ مذہب زندگی کے ہر شعبہ پر چھایا ہوا تھا، غیر مذہبی تہواروں کو سماجی حیثیت دینے کے لئے انھیں بھی مذہب کی خراد پر چڑھایا گیا۔ سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کا چلن بڑھتا رہا اور صدیوں کے سماجی ارتقا میں ان کی شکل کیا سے کیا ہو گئی۔ ہندستانی تہواروں کی اصلیت پر اگر اس نظر سے غور کیا جائے اور رسم و رواج اور مذہبی روایات کی سطح کے نیچے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے بیشتر تہوار غیر مذہبی ہیں اور ان کا گہرا تعلق ہمارے موسم کی ضرورتوں، جغرافیائی حالات اور ملکی مزاج سے ہے۔ رکھشا بندھن یا سلونو ان میں سے ایک ہے۔

ہندستان زراعتی ملک ہے۔ فصلوں کی تقسیم اور زرعی زندگی کی ضرورتوں کے لحاظ سے یہاں سال کے دو حصے کئے گئے ہیں، پہلا حصہ تقریباً چار مہینے کا اور دوسرا آٹھ مہینے کا ہے۔ ہندستان کے تہواروں کی تقسیم بھی انھیں دو حصوں کے مطابق ہے۔ موسم کے اعتبار سے پہلے حصے میں جان کی حفاظت پر اور دوسرے حصے میں تفریح اور آرام پر زور دیا گیا ہے۔ پہلے حصے کے تہوار ساڑھ سے شروع ہوتے ہیں۔ ان میں اہم ترین تہوار رکھشا بندھن ہے۔ یہ شراون کی پورنماشی پر منایا جاتا ہے ان دنوں برسات اپنے عروج پر ہوتی ہے، اور ہندستان کے کئی علاقے سیلاب کی مصیبت میں گھر جاتے [illegible] برسات کی تباہ کاریوں کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے آج سے ہزار دو ہزار سال قبل کے ہندستان کا تصور کرنا چاہئے، جب اس کا بڑا حصہ جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ برسات کی وجہ سے نباتات میں حیرت ناک اضافہ ہو جاتا ہے اور پانی کے رکنے اور سڑاند پیدا ہونے سے طرح طرح کی بیماریاں پھیلنے لگتی ہیں۔ چنانچہ رکھشا بندھن کا اصل مدعا یہ تھا کہ برسات کی آفات سے محفوظ رہنے کے لئے دیوتاؤں سے دعا مانگی جائے۔ اس روز برہمن گمبھیر اور ریاضت کرکے خلق خدا کی حفاظت کی غرض سے راکھی یعنی تعویذ بناتے ہیں جو آلام و آفات سے محفوظ رہنے کے لئے کلائی میں باندھا جاتا ہے۔ اس کے صلے میں ہر شخص برہمن کو تھوڑی سی بہت دکھشنا یعنی نذرانہ پیش کرتا ہے۔ راکھی عام طور پر رنگین اور چمکدار ریشمی یا سوتی ڈوروں سے بنائی جاتی ہے۔ بعض اوقات اس میں ہیرے جواہرات اور موتی بھی پروئے جاتے ہیں۔ اور زری و نقرئی کام بھی ہوتا ہے۔ راکھی کا مقصد چونکہ خیر و سلامتی ہے اس لئے یہ منتر پڑھا جاتا ہے:

येन बद्धो बली राजा दानवेन्द्रो महाबलः।
तेन त्वामपि बध्नामि रक्षे माचल मा चल[۱]।

یعنی جس سے دانووں کا مہابلی راجا بلی باندھا گیا تھا، اے رکھشا اسی وجہ سے تجھے باندھتا ہوں، قائم رہ، قائم رہ۔

اس منتر سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رکشا بندھن کی ابتدا راجا بلی کے زمانے میں ہوئی۔ ویدوں میں اس رسم کا کوئی ذکر نہیں

---

۱ निर्णयसिन्धु (سنسکرت) مرتبہ چندر شیکھر شرما لکھنؤ ۱۹۵۲ء ص ۱۲۸

رگ وید اور اتھروید میں रक्षक رکھشسر حفاظت کرنے والے دیوتا کی حیثیت سے سامنے آتا ہے[1]۔ راجا بلی کا ذکر پہلی بار مفصل طور پر بھاگوت پران میں ملتا ہے[2]۔ بھاگوت پران ہندو دیومالا کے اہم ترین ماخذ میں ہے۔ بعض داخلی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاگوت پران کی تصنیف کے زمانے میں آریہ سیاسی طور پر تو دراوڑیوں پر غالب آچکے تھے لیکن مذہبی اور تہذیبی سطح پر دراوڑیوں سے ان کی کش مکش جاری تھی۔ رکھشا بندھن کا پس منظر بھی اسی کش مکش کو ظاہر کرتا ہے۔ روایت ہے کہ جب راکھشسوں کے راجا بلی نے زور پکڑا تو دیوتاؤں نے وشنو سے فریاد کی۔ وشنو نے وامن اوتار یعنی چھوٹے قد کے انسان کا روپ اختیار کیا اور برہمن کی حیثیت سے خیرات حاصل کرنے کے لئے بلی کے پاس پہنچا۔ وامن نے محض تین قدم زمین کا سوال کیا۔ راجا نے اقرار کر لیا تو وامن اوتار نے پہلے ہی قدم میں تمام پرتھوی اور پاتال لوک ناپ لئے۔ دوسرے قدم میں آکاش لوک بھی لے لیا۔ جب تیسرے قدم کے لئے کوئی جگہ نہ رہی تو راجا پر وشنو کی حقیقت ظاہر ہوئی۔ وشنو کا عتاب نازل ہونے ہی کو تھا کہ بلی نے برہمنوں سے مدد کی التجا کی۔ انھوں نے اس کے رکھشا کا ڈورا باندھا جس کی بدولت اس نے وشنو سے جان کی امان پائی۔

رکھشا بندھن کے بارے میں ایک اور دیومالائی روایت بھی ملتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شروع شروع میں انسانی ذہن مظاہر قدرت کی ماہیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ چنانچہ انھیں ناقابل تسخیر اور برتر کے ان کی تشخیص دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ راجا اندر بارہ برس تک راکھشسوں سے جنگ آزما رہا لیکن ان پر فتح نہ پا سکا۔ اس نے اپنے گرو برہسپتی سے مشورہ کیا۔ لیکن وہ بھی کوئی تدبیر نہ سجھا سکے۔ راجا اندر کی رفیقۂ حیات اندرانی کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس نے رشیوں منیوں کو بلا کر یگیہ اور ہون کا اہتمام کیا اور ایک راکھی تیار کر کے راجا اندر کے باندھی۔ راکھی نے اپنا اثر دکھایا۔ اندر کو فتح نصیب ہوئی۔ اور راکھشس ہار گئے۔ اسی دن سے رکھشا بندھن کی رسم کا آغاز ہوا[3]۔

عورت کی طرف سے مرد کے راکھی باندھنے کا رواج اب بھی ہے لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔ اب راکھی عام طور پر بہن کی طرف سے بھائی کے باندھی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اب یہ تہوار دوہرا مقصد رکھتا ہے۔ یعنی راکھی کے ذریعہ بہن یا صنف لطیف کی حفاظت بھائی کو سونپی جاتی ہے جو مرد ہونے کی حیثیت سے فطری طور پر مدافعت کی صلاحیت رکھتا ہے اور "مل جایا" ہونے کی وجہ سے جس کا رشتہ اٹوٹ ہے۔

البتہ جنوبی ہندستان میں رکھشا بندھن کا تہوار مختلف طور پر منایا جاتا ہے۔ وہاں اسے "ناریل پورنما" یعنی ناریل کا دن کہتے ہیں۔ جنوب میں ساون کی پورن ماشی تک مون سون کا زور تقریباً ختم ہو جاتا ہے اور اس دن عوام برسات کے بخیر و عافیت گذر جانے کے بعد ورن वरुण یعنی پانی کے دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ دریاؤں اور سمندروں کے کنارے بڑے بڑے میلے لگتے ہیں۔ ورن کے چڑھاوے کے طور پر پانی میں ناریل پھینکے جاتے ہیں۔ اور دان پن کیا جاتا ہے[1]۔

شمالی ہندستان میں بہن کی طرف سے بھائی کے راکھی باندھنے کا رواج غالباً راجپوتوں سے شروع ہوا اور ان کے بعد راکھی کی رسم مغلوں میں بھی ہر دل عزیز اور مقبول رہی۔ عہد وسطیٰ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے جو مشترک تہذیب پیدا ہوئی تھی اس میں ایک دوسرے کے تہذیبی اداروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور دونوں ایک دوسرے کے تہواروں میں سچے دل سے شریک ہوتے تھے۔ سلونو کا رواج مغل بادشاہوں میں ہمایوں کے زمانے سے جاری ہوا۔ اس کی ابتدا کا واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن اس کے لئے ہمیں تاریخ کے اوراق الٹنا پڑیں گے۔ سلونو کے بارے میں راجستھان کی ویر گاتھاؤں میں ایک روایت آج تک مشہور ہے اور اسے کرنل ٹاڈ نے بھی بیان کیا ہے۔ رانا سانگا کی بیوہ کرناوتی[2] نے اپنے نو عمر بچے اودے سنگھ کی حفاظت کے لئے ہمایوں کی حمایت حاصل کرنا چاہی تھی۔ میواڑ کی رانی نے اپنے سفیر ہیم شاہ کے ذریعے ہمایوں کو راکھی بھجوائی۔ بادشاہ نے اسے بخوشی قبول کیا اور رسماً رانی کرناوتی کو زر و جواہر اور تحفے بھی ارسال کئے۔ اس طرح ہمایوں راکھی کے ذریعے رانی کا بھائی اور اس کے نو عمر بیٹے اودے سنگھ کا ماموں اور محافظ بن گیا۔ چنانچہ جب بہادر شاہ والی گجرات نے چتوڑ پر حملہ کیا تو مجبوراً کرناوتی نے ہمایوں سے مدد کی التجا کی۔ ہمایوں اس وقت اپنی راجدھانی سے بہت دور بنگال کی طرف گیا ہوا تھا۔ وہ اس مہم کو نامکمل چھوڑ کر واپس تو آیا لیکن اس نے بہادر شاہ پر حملہ کرنے کے بجائے اس سے لفظی تکرار شروع کر دی جس میں لفظ چتوڑ پر جگت بازی کو دخل تھا۔ ابھی یہ بات چیت جاری تھی کہ بہادر شاہ کے توپ خانے کے سامنے راجپوت ٹک نہ سکے اور انھوں نے دم توڑ دیا

باقی صفحہ ۷ پر

---

[1] رگ وید I ۱۲۸۹-۵ II ۳۹ ؛ ۶ اتھروید III ۲۷ ؛ ۱ XII ۳ ؛ ۵۵

[2] شریمد بھاگوت پران ، بمبئی سمت ۱۹۸۶ ، ص ۶۲۶

[3] برتارک (سنسکرت) ، مولفہ شنکر بھٹ ، لکھنؤ سمت ۱۹۳۲ بکرمی ، ص ۶۲۹

---

[1] HINDU RELIGION, CUSTOMS AND MANNERS P. THOMAS بمبئی ۱۹۵۲ء ص ۹۶ اور ۱۲۸

HINDU HOLIDAYS AND CEREMONIES آر. بی. گپتا کلکتہ ۱۹۱۹ء ص ۲ ۱۰

[2] اس نام کو مختلف مورخین نے مختلف انداز میں لکھا ہے۔ جیمس ٹاڈ نے "کرناوتی" بتایا ہے۔ (ANNALS AND ANTIQUITIES OF RAJASTHAN لندن ۱۹۱۴ء ص ۲۶۸) ایشوری پرشاد نے "کرم وتی" لکھا ہے (LIFE & TIMES OF HUMAYUN کلکتہ ۱۹۵۵ء ص ۶۶) لیکن راجستھان کی قلمی ویر گاتھاؤں میں "کرمتی" بتایا گیا ہے۔ (قلمی نسخہ راول رنا جی کی وات ورق الف ۸۶ بحوالہ MEWAR AND THE MUGHAL EMPERORS از جی. این. شرما ، آگرہ ۱۹۵۴ء ص ۵۰)

ہماری زبان
۱۵ راگست ۱۹۶۲ء

یوم آزادی

یہ دن ہمارے لئے خوشی کا بھی ہے اور اپنے کارناموں کا جائزہ لینے کا بھی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہم برابر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہماری ترقی کی رفتار ہماری خواہش اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ ابھی حال میں میسور میں پی۔ آئی۔ اے کی ایک کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریہ نے فرمایا کہ ہم ابھی تک فرقہ پرستی، ذات پات کی تفریق، علاقائی تعصب اور لسانی جانبداری سے بلند نہیں ہو سکے ہیں، ہمیں ملک کی وحدت کی خاطر ان الجھنوں سے نکلنا ہے۔" ہماری آزادی کو اب پندرہ سال ہو گئے۔ پندرہ سال میں جاپان اور جرمنی جیسے ملکوں نے جنگ کی تباہ کاری کا ہر نقش مٹا دیا اور اپنی صنعت و تجارت کی دھاک بٹھا دی۔ روس اور امریکہ نے فضا میں اپنی ہمت و جرأت کے جھنڈے گاڑ دئے۔ ہم نے بھی صنعتی دور میں قدم رکھا ہے، جمہوریت کے تجربے کو بہت بڑے پیمانے پر کامیاب بنانے کی کوشش کی ہے۔ دو پنج سالہ منصوبے پورے ہو چکے ہیں، ہماری قومی آمدنی بڑھی ہے۔ ہماری عمر کا اوسط بھی پہلے سے بہت بہتر ہے۔ ہمارے یہاں خواندگی کی شرح میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ابھی تک ہم ملک کے مفاد کو سب سے آگے نہیں رکھ سکے ہیں، نہ جمہوریت، مساوات اور مشترک تہذیب کے تصورات کو پوری طرح ذہنوں میں جما سکے ہیں۔ گویا ہمارا ایمان ابھی زبان سے اقرار کی منزل میں ہے، دل کی تصدیق کی منزل تک ابھی ہم نہیں پہنچے۔ ہمیں آج کے دن در اصل اپنے سے یہ عہد کرنا ہے کہ ہم اپنے ملک کو اصلی منزل مقصود کی طرف لے جانے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ہم جمہوریت کی روح کو اپنائیں گے، ہم آپس کے چھوٹے موٹے اختلافات کو بحث اور گفتگو سے طے کریں گے، ہم مذہب اور ذات پات کی بنا پر لوگوں میں امتیاز نہ کریں گے، ہم جن زبانوں کو قومی کہتے ہیں اُن کی بقا اور ترقی کے لئے پورا سامان کریں گے اور کسی بہانے یا داؤں کا شکار نہ ہوں گے۔ ہم سوشلزم کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھیں گے اور اپنی مشترک تہذیب کو جس کے پیچھے ہندوستان کی پوری تاریخ ہے، ہر رنگ اور ہر پہلو سے اپنی زندگی میں جاری و ساری کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ کام صرف حکومت کے کرنے کا نہیں، ہم سب کے کرنے کا ہے۔ یہ صرف ایک سیاسی پارٹی یا اکثریت کی ذمے داری نہیں، سب کی ذمے داری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم سب آج کے مبارک و مسعود دن، ایک بار پھر ملک و قوم کی خدمت کا نئے سرے سے عہد کریں گے۔ اپنے حقوق پر بھی اصرار کریں گے اور ان سے کسی طرح دست بردار نہ ہوں گے، مگر اپنے فرائض کا ہر حال میں خیال رکھیں گے۔

معاصر

فلم ڈویژن اور اُردو

عوام کی معلومات اور اطلاعات کے لئے مرکزی حکومت کے فلم ڈویژن کی جانب سے دو قسم کی فلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ ایک تو ان میں نیوز ریل ہوتی ہیں اور دوسری ڈاکومنٹری (دستاویزی) فلمیں۔ نیوز ریل میں ملکی اور غیر ملکی سرگرمیوں پر مختصر خبروں کی شکل میں روشنی ڈالی جاتی ہے اور ڈاکومنٹری فلمیں کسی ایک عنوان پر ہلکی پھلکی کہانی کی شکل میں ایک تبصرہ ہوا کرتی ہیں۔ ملک کے تمام گوشوں میں خاطر خواہ تشہیر کی خاطر یہ فلمیں سنسکرت کے سوا دستور ہند کی منظور شدہ تمام زبانوں میں تیار کی جاتی ہیں جن میں اردو بھی شامل ہے۔

ظاہر ہے کہ جن علاقوں میں جس زبان کے بولنے اور سمجھنے والوں کی اکثریت یا خاصی بڑی تعداد ہوتی ہے ان علاقوں میں اسی زبان کی فلمیں نمائش کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن ہم نے شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ اُردو کے معاملہ میں فلم ڈویژن کے انتظامات نہایت ناقص ہیں کیونکہ اُردو فلموں کی نمائش صرف کشمیر، دہلی اور حیدرآباد میں کی جاتی ہے۔ حالانکہ اور بھی کئی ایسے بڑے شہر ہیں جہاں اُردو بولنے والوں کی اگر اکثریت نہیں تو ایک خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔ انہی میں شہر بمبئی بھی ہے جس کو آج ہندستان میں اُردو کے ایک مرکز کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ یہ شہر نہ صرف اُردو کے ہندستان گیر شہرت رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کا مسکن بن چکا ہے بلکہ مرہٹی بولنے والوں کے بعد اُردو بولنے والوں کی تعداد گجراتی یا انگریزی بولنے والوں سے کسی طرح کم نہیں۔ حتیٰ کہ شہر بمبئی کے بعض رقبے ایسے بھی ہیں جہاں اُردو بولنے والے غالب اکثریت رکھتے ہیں لیکن افسوس کہ اس حقیقت کو بُری طرح نظر انداز کر دیا گیا ہے اور شہر بمبئی میں کسی جگہ بھی اُردو فلموں کی نمائش نہیں کی جاتی جس شہر کی کاسموپولیٹن حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے ہندی اور مرہٹی کے علاوہ گجراتی اور انگریزی فلموں کی نمائش بھی کی جاتی ہے وہاں اُردو جیسی مقبول عام زبان کی طرف سے غفلت برتنا بہت بڑی زیادتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس غفلت کو فلم ڈویژن کے اغراض و مقاصد کے ساتھ بھی ایک بڑی زیادتی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ بمبئی کے ایسے رقبوں کے سینما گھروں میں جہاں اردو بولنے والوں کی غالب اکثریت موجود ہے، ہندی، مرہٹی، گجراتی یا انگریزی فلمیں قطعی کوئی جاذبیت نہیں رکھتیں اور عوام ان کی طرف بالکل مائل نہیں ہوتے۔ اس طرح فلم ڈویژن کا تشہیر کا مقصد بُری طرح فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم کنٹرولر آف فلم ڈویژن بمبئی اور محکمہ نشر و اشاعت حکومت ہند سے امید کرتے ہیں کہ بمبئی جیسے کاسموپولیٹن شہر میں ہندی، مرہٹی، گجراتی اور انگریزی کی طرح بعض مخصوص سینما گھروں میں اردو فلموں کی نمائش کا بھی انتظام کیا جائے گا تاکہ اُردو بولنے والے اور عام عوام معلومات سے محروم نہ رہ سکیں جن کی اشاعت کے لئے حکومت کثیر رقومات صرف کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں فلم ڈویژن پر کوئی بھاری بار بھی نہیں پڑے گا کیونکہ یہ مسئلہ اردو کی چند کاپیاں زیادہ تیار کر لینے سے حل ہو سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ارباب متعلقہ اس طرف پوری پوری توجہ دیں گے اور وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کریں گے۔

(ماہنامہ صبح امید۔ بمبئی)

مولانا حفظ الرحمٰن کے تعزیتی جلسے

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ

انجمن ترقی اردو لکھنؤ کا جلسہ بسلسلۂ تعزیت مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی زیر صدارت پنڈت آنند نرائن ملا صاحب صدر انجمن منعقد ہوا۔ جلسہ میں مقامی انجمن کے ممبران کے علاوہ صوبائی انجمن کے اراکین یونیورسٹی کے اساتذہ اور دوسرے ادیب بھی شریک ہوئے۔ پنڈت آنند نرائن ملا بیگم سلطانہ حیات، مولانا محمد یونس خالدی نے، مرحوم کی عام انسانی ہمدردی، سیاسی بصیرت، جمہوریت نوازی، بے باکی، بے خوفی، اردو زبان سے آخری لمحہ تک محبت و دلچسپی کے متعلق خراج عقیدت پیش کیا! آخر میں حسب ذیل تجویز تعزیت متفقہ طور پر منظور کی گئی۔

"انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کا یہ جلسہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے، مولانا کی موت سے ملک و قوم کو عموماً اور اُردو دنیا کو خصوصاً ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اُردو زبان سے مرحوم کو ہمیشہ قلبی تعلق رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اردو پر جو وقت پڑا اس کا مقابلہ مرحوم نے بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ کیا۔ اور نہایت خوبی اور تدبر کے ساتھ اُردو کی رہنمائی و قیادت کرتے رہے یہاں تک کہ بستر علالت پر بھی اُردو کے لئے بے چین رہے۔ سہ لسانی فارمولے کی غلط تشریح کے سلسلے میں وزیر اعظم ہند اور وزیر اعلیٰ یو پی دونوں کو متوجہ کیا۔ مرحوم کی دلی تمنا یہی تھی کہ جمہوریہ ہند میں اُردو کو اس کا صحیح مقام ملے۔ مولانا اُردو زبان کے بلند پایہ مصنف اور بے مثل خطیب بھی تھے۔ افسوس کہ اُردو دنیا اس جامع الکمالات شخصیت اور ہمہ صفت ہستی سے محروم ہو گئی جو اُردو کے لئے ہر وقت سینہ سپر رہتی تھی۔ انجمن کا یہ جلسہ مولانا کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور ان کے رنج و غم میں برابر کا شریک ہے۔ نیز خدا سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔"

انجمن ترقی اُردو دہلی

۸ر اگست کی شام کو دلّی پبلک لائبریری میں انجمن ترقی اُردو دلّی شاخ کے زیر اہتمام حضرت مولانا حفظ الرحمٰن علیہ الرحمۃ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت دلّی کے میئر جناب نورالدین احمد نے کی۔ مقررین میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا سید محمد میاں، مولانا حامد الانصاری غازی شامل تھے۔ جن شعرا نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ان میں روش صدیقی، سلام مچھلی شہری، گلزار دہلوی، خان غازی کابلی، بہار برنی، عزیز وارثی، کشور جوہر بھی شامل تھے۔ صدر جلسہ نے حسب ذیل تجویز پیش کی جو متفقہ طور پر منظور ہوئی۔

تجویز:

"انجمن ترقی اُردو دلّی کا یہ عام اجلاس حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کے انتقال پر ملال پر اپنے دلی رنج و اندوہ کا اظہار کرتا ہے اور مولانا کی وفات کو ملک و قوم کے لئے ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے۔ مولانا مرحوم جنگ آزادی میں اوائل عمری سے شریک ہوئے وہ اُن چند مخصوص سیاسی رہنماؤں میں سے تھے۔ جن کو مہاتما گاندھی کا پورا اعتماد حاصل تھا اور جو زندگی بھر ان کے رفیق کار رہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن وطن کی آزادی اور قومی اتحاد کے لئے تمام عمر کوشاں رہے، تقسیم ملک کے بعد اُردو کی بقا و تحفظ کے لئے بھی انھوں نے بہت کام کیا، اس عالم میں بھی کہ وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے، انھوں نے یو، پی کے بڑے وزیر مسٹر سی، بی، گپتا کو امریکہ سے خط لکھا، اور سہ لسانی فارمولے میں اُردو کو شامل کرنے کی طرف توجہ دلائی۔

یہ اجلاس دلّی کارپوریشن، نئی دلّی میونسپل کمیٹی اور دلّی ایڈمنسٹریشن سے درخواست کرتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے نام پر ایک ہائر سیکنڈری اسکول کھولا جائے۔ جس میں ذریعہ تعلیم اُردو ہو، نیز "لیننگ لین" کا نام بدل کر "حفظ الرحمٰن لین" کر دیا جائے۔ یہ مرحوم موصوف کو خراج عقیدت پیش کرنے کا صحیح طریقہ ہوگا۔"

آزاد لائبریری جگلمنڈی

مولانا حفظ الرحمٰن ایم پی۔ ناظم جمعیۃ علما کی وفات حسرت آیات کی خبر سنکر آزاد لائبریری جگلمنڈی کا ایک غیر معمولی جلسہ ۳ر اگست ۶۲ء کو منعقد ہوا۔ اس تعزیتی جلسے کی صدارت لائبریری کے صدر جناب عبد اللطیف صاحب بوجگر نے فرمائی۔ اس موقع پر کئی مقررین نے مولانا کی حیات طیبہ اور قومی خدمات پر روشنی ڈالی۔ دو منٹ کی خاموشی کے بعد جلسے نے متفقہ طور پر ایک تعزیتی قرارداد منظور کی جو حسب ذیل ہے۔

قرارداد:-

"آزاد لائبریری جگلمنڈی (ریاست میسور) کا یہ جلسہ عام مولانا حفظ الرحمٰن کے انتقال پر ملال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم کی بے وقت موت سے ملک و قوم کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ مرحوم نے جد و جہد آزادی کے موقع پر اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں، ہندوستانی قوم اسے آسانی سے فراموش نہیں کر سکتی۔ مولانا اُردو زبان کے بھی بہت بڑے خدمتگزار تھے۔ اُن کی موت سے ملک میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو مشکل ہی سے پُر ہو سکتا ہے۔ یہ جلسہ عام خدا سے دعا گو ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل، اور قوم کو ان کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کی توفیق دے۔"

جامعہ اُردو علی گڑھ

جامعہ اُردو کے دفتر میں سید ظہیر الدین صاحب علوی رجسٹرار جامعہ اُردو کی صدارت میں اراکین کا ایک ہنگامی جلسہ ہوا، شرکائے جلسہ نے مولانا کی اچانک رحلت پر اظہار افسوس کیا۔

شہاب سرمدی

جھانکیاں

(۱)

(بھادوں)

اُزز، اُزز، گرجے برسے
گھوم پڑی پُروائی
دُھواں اُٹھاوت آندھی پانی
بھادوں دیت دوہائی
رین اندھیری کاجل کالی
داسن دیپ جلائے
اُتر لُوکت، دکھن گُوکت
بھوساگر گھبرائے۔
پھولن سیج سجائے سجنی
سولہو کرے سنگھار
اُٹھ اُٹھ پی کی راہ نہارے
بچھوا سنکے،
بچھوا جھنکے،
بجری چمکے،
گھنگھٹا سرکے،
بدرا گرجے
جیرا لرجے
جیرا لرجے، من لہرائے
پی بن رہا نہ جائے

(۲)

(چوماسہ)

رُت چڑھ آئی چوماسے کی
بن سیما بس کھڑی جُوار
دُور سے جھلکیں تال تلیا
پنکھ پکھیرو کریں پکار
پِیتن بیٹھ پنوارا گاویں
بھجنی کہت کہار
آلہا گاوت گاؤں کے چھیلا
گھر باہر گونجے للکار
"چھپ چھپ، چھپ چھپ کا-گا باجے
جھنن جھنن باجے تروار"
"ہر رام" "ہر رام" گاوت نکسیں
سانوری، گوری، چنچل نار
شیام سلونے بدرا چھائے
رِم جھم، رِم جھم، پڑے پھوار
چونکی چوزنگ پہ چھیت
انچرا اُڑ اُڑ جائے:
امرتن بان پڑے ہنڈولے
پینگ اُٹھے پھنگی چھو جائے
چٹکے ڈھولک "تک دھن تک دھن"
کجری دھوم مچائے
ایک سُریلی بول بناوت
دوسر ٹیپ اُٹھائے
"سونا، روپا، کوئی نہ پہنی
پردیسن کالے پی بلائے"
بیچ ماں ٹھاڑی نین رسیلی
بھر بھر ہاتھ رچائے مہندی
چھین کمریا، کس مس چولی
لچ لچ، پینگ بڑھائے
تان پہ تان لگائے
رس بوندن برسائے
آپن آپ لجائے
دانتن چیر دبائے۔

غزلیں

فیض احمد فیض   (ایک تازہ غزل)

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
اُدھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا
جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

(افکار- کراچی)

قضا ابن فیضی

وہ نظر گرمِ التفات ہوئی — تو نئی آج ایک بات ہوئی
کچھ تو بولو کہ زندگی جھلکے — تم ہو چپ یہ بھی کوئی بات ہوئی
کس سے پوچھوں بھلا کہ کونسی بات — وجہِ ترکِ تعلقات ہوئی
بن گئے خود ہی اک ستم ہم — جب نظر واقفِ صفات ہوئی
ہاں! یہی آرزوئے دل کی بساط — کچھ جو پھیلی تو کائنات ہوئی
اے قضا اس کے سانس کی خوشبو
عطرِ پیراہنِ حیات ہوئی

محمد اکبر الدین صدیقی

رسالہ "افسر"

یکم جنوری ۱۹۶۲ء کے ہماری زبان میں جناب عابد رضا بیدار صاحب کا مضمون افسر سے متعلق شایع ہوا ہے۔ بیدار صاحب کو پانچویں جلد کے دو پرچے مئی اور جون ۱۹۰۱ء کے شمارے نمبر ۵ و ۶ ملے ہیں۔ اس پر انھوں نے یہ دو نتیجے اخذ کیے۔

(۱) ۱۸۹۹ء میں افسر کا اجرا

(۲) بابائے اردو نے افسر کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا۔ چونکہ موصوف کو پانچویں جلد کے دو شمارے ملے اور بابائے اردو ۱۸۹۸ء میں حیدرآباد آئے اس لیے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا گیا کہ ۱۸۹۹ء میں دو جلدیں اور ۱۹۰۰ء میں دو جلدیں نکلیں۔

کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں رسالہ افسر کی دو جلدیں محفوظ ہیں۔ پہلی جلد مولوی محب حسین مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر صادق حسین صاحب کی عطیہ ہے اور دوسری چوتھی جلد ہے جو خریدی گئی ہے۔ افسر کا پہلا شمارہ اپریل ۱۸۹۷ء میں نکلا جس کے سرورق پر ابتدا میں چمڑے کے بلٹ کے ساتھ کرچ کی تصویر ہے جو عام طور پر فوجیوں کی کمر میں لگی ہوتی ہے۔ اس کے نیچے جلی قلم میں رسالہ کا نام سیدھا اور الٹا اس طرح لکھا ہے۔ افسر ۔ اس کے نیچے ایک سطر پر

جلد (۱) ۔ بابت ماہ اپریل ۱۸۹۷ء نمبر (۱)

مرتبہ عالیجناب میجر افسرالدولہ بہادر کمانڈر امپیریل سروس ٹروپ گولکنڈہ بریگیڈ و اڈیکانگ اعلیٰ حضرت بندگان عالی حضور پرنور والی ریاست حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع علم شفیق واقع گوشہ محل حیدرآباد دکن۔ تحریر ہے۔

سرورق کی پشت پر دستور العمل رسالہ افسر لکھا ہے جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسالہ بالکلیہ فوجی اور حربی مضامین کی اشاعت کے لئے جاری کیا گیا اور ہدایت کی گئی ہے کہ مضامین افسرالدولہ کی خدمت میں بھیجے جائیں۔ خریداری کی درخواست افسرالدولہ یا نواب ممتاز یار جنگ بہادر کپتان فوج صرف خاص یا خادم الملک محب حسین معتمد دفتر رسالہ مذکور سے کی جائے۔ اس کے بعد ہی رسالۂ دلگداز کے اشتہار کی ایک سطر اس طرح لکھی ہے:۔

"یہ نادر رسالہ جو علم ادب کی جان اور ناول کی روح ہے، ہر ماہ محی الدین بادشاہ کے دیہاں سے آخری صفحہ ٹائٹل کے (اندرونی حصہ پر) باغ واقع حیدرآباد دکن سے شایع ہوتا ہے۔ اس کے مصنف مولانا عبدالحلیم شرر ہیں جن کی تصنیفات نے ہندوستان میں وہی شہرت حاصل کی ہے جو انگلستان میں سر والٹر اسکاٹ اور رینالڈ کی تصانیف کو حاصل ہے۔ ان کی ذاتی لیاقت اور مدت العمر کا تجربہ اس رسالے کی مقبولیت کا ایک عمدہ سرٹیفکٹ ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔ سالانہ قیمت صرف دو روپے کلدار ! باچگر خالی ہیں۔" اس کے بعد اسی صفحے پر محب حسین مرحوم کی انگریزی سے ترجمہ شدہ ناول "میرا پہلا جرم" کا اشتہار ہے اور دوسرا اشتہار ان کے رسالے معلم نسواں کا ہے جو اس کے ٹائٹل کے بیرونی صفحہ پر ختم ہوا ہے۔ پہلا شمارہ ۴۲ صفحوں پر مشتمل ہے جس میں ایک ہی ترجمہ شدہ مضمون ہے جس کا عنوان "طرز تعلیم فوج روس" ہے۔ غالباً یہ ترجمہ محب حسین ہی کا ہے۔

دوسرے رسالے یعنی مئی ۱۸۹۷ء کے شمارے پر مرتب کا نام نہیں۔ کرچ کی تصویر کے نیچے سیدھے طریقے سے افسر لکھ دیا ہے اور اس کے نیچے فہرست مضامین دے دی ہے۔ فوجی ورزش کے زیر عنوان محب حسین کا مترجمہ مضمون ہے۔ اس کے بعد افسرالدولہ کی ایک تقریر ہے پھر فوجی مضامین ہیں جن میں اکثر بلکہ سب محب حسین صاحب کے ترجمہ کردہ معلوم ہوتے ہیں۔ مترجم کا نام نہیں لکھا ہے۔

جون میں تیسرا پرچہ شایع ہوا جس میں کرچ کے نشان کے اوپر العظمت للہ اور نیچے افسر لکھا ہے اور نچلی سطر ہے "فوجی مضامین اور فوجی نامور اشخاص کے تذکرے"۔ اس پر بھی مرتب کا نام نہیں۔ چوتھا پرچہ جو جولائی ۱۸۹۷ء میں شایع ہوا ٹائٹل کے بعد اندرونی ٹائٹل بھی ہے جس کے نصف حصے پر زیر سرپرستی کے بعد افسرالدولہ کا نام مع القاب و خطابات ہے۔ دوسرے نصف پر مضامین کی فہرست ہے جس میں محب حسین کے ترجموں کے علاوہ نواب عماد نواز جنگ (حسن بن عبداللہ) کمشنر کروڑگیری کا مضمون "جنگ چین و جاپان" ہے۔ یہ وہی عماد نواز جنگ ہیں جنھوں نے ۱۸۸۸ء میں رسالہ حسن جاری کیا تھا اور جس کے ہر شایع شدہ مضمون پر ایک اشرفی مضمون نگار کو نذر کی جاتی تھی۔ اس کے پرچے حیدرآباد کے اکثر کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ادارے میں بھی ۱۸۹۶ء تک اس کی تقریباً ہر جلد کے متفرق یا مکمل پرچے موجود ہیں۔ اگست کے پرچے میں کوئی خاص بات قابل تحریر نہیں البتہ ستمبر ۱۸۹۷ء کے پرچے میں جو چھٹا شمارہ ہے افسرالدولہ کی سرپرستی اور ممتاز یار جنگ کے اہتمام کے ساتھ مرتب محب حسین لکھا ہے اور پھر دسمبر ۱۸۹۷ء تک سرورق اسی طرح تحریر ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جہاں محب حسین مرحوم نے حیدرآباد سے کئی اخبار یعنی شفیق، معلم، معلم شفیق، معلم نسواں، علم و عمل وغیرہ نکالے۔ مثلاً افسر بھی انھوں نے جاری کیا جس کا پہلا شمارہ اپریل ۱۸۹۷ء میں انھیں کے مطبع میں انھیں کی ترتیب و اہتمام سے چھپا۔ نہ کہ بابائے اردو نے جاری کیا جیسا کہ اکثر حضرات مثلاً رشید احمد صدیقی، افضل صدیقی اور بیدار صاحب نے لکھا ہے۔

بقیہ

سلونو کی تہذیبی اہمیت

رانی کرناوتی نے قلعہ ہاتھ سے جاتے دیکھا تو وقت کی زندگی پر موت کو ترجیح دی اور ہزاروں[1] راجپوت عورتوں کے ساتھ جوہر کی آگ میں کود کے مر گئی۔ مارچ ۱۵۳۵ء میں قلعہ فتح ہو گیا۔ اس کے بعد ہمایوں اور بہادر شاہ میں کئی جھڑپیں ہوئیں اور بالآخر اس کے سپاہیوں سے چتوڑ خالی کرا کے راجپوتوں کو واپس کر دیا گیا۔ کرنل ٹاڈ کا بیان ہے کہ اگر ہمایوں اتنا دور نہ ہوتا اور اپنے روایتی تساہل سے کام نہ لیتا تو چتوڑ کی تباہی پیش نہ آتی[2]۔ اس کے باوجود ہمایوں نے بہادر شاہ کا تعاقب کیا اور بالآخر وہ پرتگیزوں کے ہاتھوں نہایت بے رحمی سے مارا گیا۔[3]

لیکن معاصر اور مستند فارسی تاریخوں میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ان کا بیان ہے کہ ہمایوں کا بہادر شاہ والیٔ گجرات سے نبرد آزما ہونا راجپوتوں کی امداد کی غرض سے نہ تھا۔ بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ بہادر شاہ نے عالم خاں اور محمد زماں مرزا دو باغیوں کو پناہ دے رکھی تھی اور انکی معاونت کر رہا تھا۔ ہمایوں کے بار بار منع کرنے پر بھی اس نے توجہ نہ کی تو ہمایوں اس کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ بہادر شاہ اس وقت چتوڑ کے محاصرے میں مصروف تھا۔ بادشاہ کی آمد کی اطلاع پا کر اس نے چتوڑ کی مہم موقوف کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے وزرا اور امرا نے مشورہ دیا کہ ہمایوں دیندار بادشاہ ہے جب تک ہم راجپوتوں کے خلاف لڑ رہے ہیں، وہ ہم پر حملہ آور نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہمایوں اس وقت تک رکا رہا جب تک بہادر شاہ نے چتوڑ فتح نہ کر لیا۔[4]

ان تاریخوں سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں مذہبی دباؤ کی وجہ سے محاصرۂ چتوڑ کو ختم نہ کرا سکا۔ لیکن کرنل ٹاڈ کے اس بیان کی تردید نہیں ہوتی کہ رانی نے راکھی بھیج کر ہمایوں سے امداد طلب کی تھی۔ ایشوری پرشاد کا بیان ہے کہ رانی نے مدد ضرور طلب کی لیکن ہمایوں بوجوہ میواڑ کو بروقت بچانے کی کوشش نہ کر سکا۔ بہادر شاہ نے رانا بکرماجیت والیٔ چتوڑ سے جو معاہدہ کیا، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رانا بے یار و مددگار تھا[5]۔ تاہم ہمایوں کی ہمدردی راجپوتوں کے ساتھ تھی۔ چنانچہ جب موقع آیا تو ہمایوں نے نہ صرف بہادر شاہ کو شکست دی بلکہ رانا بکرماجیت کو اس کے دشمن کے مفتوحہ علاقے مانڈو میں بلا کر اس کے تلوار باندھی اور چتوڑ راجپوتوں کو واپس دے دیا۔[6]

بہر حال راکھی کے اس رواج نے آگے چل کر مغلوں اور راجپوتوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کے رشتوں کو مضبوط بنانے میں اہم خدمت انجام دی۔ اکبر نے راجپوتوں سے ازدواجی تعلقات قائم کر کے اس روایت کو اور آگے بڑھایا۔ چنانچہ راکھی کو سلونو کا نام اکبر ہی کے زمانے میں دیا گیا۔ لفظ "سلونو" فارسی ترکیب "سالِ نو" سے بنا ہے۔ یہ تہوار چونکہ ساون کی پورن ماشی پر منایا جاتا ہے۔ اور اسی دن فصلی سن کی رو سے نیا سال شروع ہوتا ہے۔ اس لئے سالِ نو کی رعایت سے راکھی کا تہوار بھی سلونو کہا جانے لگا۔[7]

اکبر کے جانشین جہاں گیر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہندوؤں کی اکثر تقریبوں میں شامل ہوتا تھا۔ اور سلونو کے دن ہاتھ پر ہندوؤں کی طرح راکھی باندھتا تھا۔

مغل بادشاہوں کو اس تہوار سے جو لگاؤ تھا اس کا مزید ثبوت شاہ عالمگیر ثانی کے قتل کے واقعہ سے ملتا ہے۔ شاہ عالمگیر ثانی کو ۱۷۵۹ء میں عماد الملک نے کوٹلہ فیروز شاہ میں ایک فقیر کی قدم بوسی کرانے کا دھوکہ دے کر مروا ڈالا تھا۔ "یہ واقعہ رات کے ابتدائی حصے میں ہوا۔ اتفاق سے رات چاندنی تھی اور بادشاہ کی خون آلود لاش جنگل میں پڑی تھی۔۔۔

---

[1] جیمس ٹاڈ نے جوہر کرنے والی عورتوں کی تعداد تیرہ ہزار بتائی ہے۔ (ص ۲۵۰)

[2] ANNALS AND ANTIQUITIES OF RAJASTHAN ص ۲۵۰۔ نیز ملاحظہ ہو: S.K. BANERJI: HUMAYUN BADSHAH آکسفورڈ، ۱۹۳۸ء ص ۱۱۵

[3] G.N. SHARMA: MEWAR AND MUGHAL EMPERORS حوالہ ما قبل۔ شرما نے اس واقعہ کا ذکر راجپوت دیرگا نقاؤں کے ان قلمی نسخوں کے حوالے سے کیا ہے جو راجستھان کے پوتھی خانوں میں محفوظ ہیں۔

[4] A HISTORY OF THE GREAT MOGHULS: PRINGLE KENNEDY کلکتہ، ۱۹۰۵ء ص ۱۴۵

[5] تذکرۃ الواقعات از جوہر مترجمہ اسٹورٹ، لندن ۱۹۳۲ء ص ۱۳۔ نیز ملاحظہ ہو AN ARABIC HISTORY OF GUJRAT "ظفر الوالہ" محمد بن عمر مکی، لندن ۱۹۱۰ء جلد اول ص ۲۳۰۔ تاریخ گجرات شاہ ابو تراب ولی، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ ۱۹۰۹ء ص ۱۳۔ اکبر نامہ، ابو الفضل، کلکتہ ۱۸۷۷ء جلد دوم ص ۱۳

[6] LIFE AND TIMES OF HUMAYUN ایشوری پرشاد، کلکتہ ۱۹۵۵ء ص ۱۷

[7] تاریخ راجگان ہند موسوم بہ وقائع راجستھان: محمد نجم الغنی رام پوری، لکھنؤ ۱۹۲۶ء ص ۱۰۳

[8] اس لفظ کو "سلونوں" بھی کہتے ہیں، ملاحظہ ہو فرہنگ آصفیہ جلد ۳ ص ۹۲۔ نیز "برہان" حوالہ سابق ص ۹۲۹۔ نیشکن نوراللغات میں "سلونو" ہی درج ہے (جلد ۳ ص ۱۹۸) ضیاء الدین نے "بزم آخر" (بار سوم دہلی ۱۹۳۰ء ص ۴۳) اور رام پرشاد کھوسلہ نے "ہندو تہواروں کی اصلیت" (لکھنؤ ۱۹۴۳ء ص ۷۷) میں بھی "سلونو" ہی لکھا ہے۔

ایک برہمن عورت رام کور جمنا کے اشنان سے واپس آرہی تھی تو ایک آدمی کو سوتا دیکھ کر جھجکی۔ مگر غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ لاش بادشاہ کی ہے۔ وہیں بیٹھ گئی اور رونے لگی۔

رات کا بڑا حصہ اسی طرح بسر ہوا۔ جب بادشاہ کی واپسی میں دیر ہوئی تو ارکین وزرا پریشان ہوئے اور کوٹلے پہنچے۔ اندر جاکر کونہ کونہ اور چپہ چپہ چھان مارا، فقیر کا پتہ نہ چلا... نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک لاش اور عورت دکھائی دی...

شاہ عالم باپ کی جگہ تخت نشین ہوئے۔ رام کور کو اس کی خدمات کا صلہ کہ اس نے رات بھر بادشاہ کی لاش کی حفاظت کی سر دربار خلعت فاخرہ ملا۔ آج سے رام کور شاہ عالم کی بہن بنی، سلونو کے روز وہ بہن کی حیثیت سے سچے موتیوں کی راکھی جس میں سونے کی گھنڈیاں ہوتیں، بادشاہ کے ہاتھ میں باندھتی اور بادشاہ حقیقی بہن کی طرح اس کو زر و جواہر دے کر گھر سے رخصت کرتے۔ شاہ عالم ثانی کے بعد اکبر شاہ ثانی نے یہ تہوار بدستور منایا اور رام کور کی بڑی لڑکی ان کے ہاتھ پر راکھی باندھتی رہی۔ اکبر شاہ کے بعد بہادر شاہ ثانی نے بھی سلونو کو اسی طرح منایا[1]۔

قلعہ معلیٰ میں یہ تہوار کیسے اہتمام و انتظام سے منایا جاتا تھا اس کی تفصیل بھی راشد الخیری کے الفاظ میں سنئے:

"برسات کا موسم کچھ ایسا دل کش موسم ہے کہ گرمی کی شدت سے پریشان چھوٹے بڑے ہر دل میں آسمان پر گھٹا آتے ہی امنگیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یوں تو ساون بھر ہی قلعہ معلیٰ اور شہر میں رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں مگر سلونو کا انتظام و اہتمام قلعہ میں آٹھ آٹھ دس دس روز پہلے سے ہوتا تھا۔ جھولے پڑے ہوئے ہیں اور سنہری روپہلی کھمبوں پر پٹیاں بھی ہوئی ہیں۔ ریشمی رسیاں ڈالی ہوئی۔ ایک طرف جو لگے، ایک طرف چوکے، کڑاہیاں چڑھی ہوئی، سامان بھرے ہوئے۔ ادھر بادشاہ نماز سے فارغ ہو کر باہر آکر بیٹھے۔ ادھر برہمنی نے راکھی باندھی۔ برہمنوں نے آسیسیں دیں، درباریوں نے دعاؤں کے نعرے بلند کئے اور قلعہ اس صدا سے گونج اٹھا۔ "مہابلی بادشاہ سلامت" آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ لکھی باغ میں آموں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جامنوں کے گچھے ہوا میں جھول رہے ہیں۔ زمین پر گلگوندوں کی بہار، آسمان پر بگلوں کی قطار دل کے پار ہوتی ہے۔ سہاالاپ رہا ہے۔ کوئل کوک رہی ہے۔ نقارے پر چوٹ پڑی، نفیری بجی اور جھولے والیاں جھولے میں گئیں۔ پینگیں بڑھ رہی ہیں۔ جھوٹے پل رہے ہیں۔ دوپہر تک جھولے اور پکوان ہوتے رہے۔ کھانا کھایا اور بادشاہ سلامت نے اپنے ہاتھ سے موتی چوڑیاں ایک ہاتھ میں پانچ اور ایک ہاتھ میں تین اپنی منہ بولی بہن کے ہاتھ میں اور خاص خاص والیوں کو جوڑے عطا ہوئے۔ نقد روپے دئے گئے۔ مٹھائیوں، بکوریوں، پوریوں کے تھال عطا ہوئے اور اس طرح یہ بہن بھائی کے انعام و اکرام سے مالا مال شاہی جوڑا پہن کر سسرال رخصت ہوئی۔"

یہ وہ زمانہ ہے جب مغلیہ سلطنت پارہ پارہ ہو رہی تھی اور ہندستان اپنے سیاسی زوال کی انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ اس کے باوجود باہمی محبت اور رواداری کے رشتے نہایت مضبوط تھے۔ ایسا صرف خواص یا درباری امرا تک ہی محدود نہیں تھا۔ بلکہ عوام بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ہماری قدیم تاریخیں اگر صرف بادشاہوں کے "جشن اور جلوسوں" کی داستان نہ ہوتیں، تو ان تہواروں کی عوامی حیثیت کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوسکتا تھا۔ تاہم شعر و ادب میں کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی قلندرانہ نظم "راکھی" میں جب ہم اس شعر پر پہنچتے ہیں:

پہن زنار اور قشقہ لگا ماتھے اوپر بارے
نظیر آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے

تو احساس ہوتا ہے کہ اس زمانے کے تہوار محض مذہبی رسوم نہیں تھے۔ اُن کی سماجی حیثیت مکمل تھی اور وہ دلوں میں فصل کا نہیں وصل کا کام دیتے تھے۔

---

[1] راشد الخیری، نوبت پنج روزہ، ص ۶۵ نیز ملاحظہ ہو بزم آخر، فیاض الدین، حوالۂ سابق ص ۳۰۷، مضامین فرحت جلد دوم ص ۷۔

ضلع میدک میں اُردو کی تعلیم

مسٹر ایم باگا ریڈی ایم ایل اے صدر ضلع پریشد نے اعلان کیا کہ ضلع میدک میں اُردو تعلیم کی ترقی و توسیع کے لیے ضلع پریشد کی جانب سے ممکنہ سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ صدر ضلع پریشد نے کل دوپہر مدرسہ فوقانیہ سداشیو پیٹھ میں اُردو ذریعہ تعلیم کی دسویں جماعت کا افتتاح کرتے ہوئے بتایا کہ ضلع میدک میں اس سال نئے اعلیٰ ثانوی اور ثانوی مدارس میں جماعتوں کے قیام کی منظوری دی گئی ہے اور تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے گریجویٹ اور تربیت یافتہ اساتذہ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اُردو داں گریجویٹ دیہی علاقوں کے مدارس میں کام کرنا پسند نہیں کرتے جس کی وجہ سے بعض اُردو مدارس میں اساتذہ کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حال ہی میں ۹۰ - ۲۰۰ کے گریڈ کی جائدادوں پر تقرر کے لیے اُردو کے بی اے اور بی ایس سی گریجویٹس سے درخواستیں طلب کی گئی تھیں لیکن انھیں یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ صرف دو امیدواروں نے درخواستیں بھیجی ہیں۔ صدر ضلع پریشد نے کہا کہ وہ ریاست میں تلگو کے ساتھ ساتھ اُردو کو بھی ترقی کا مساوی موقع دینے اور علاقائی زبان کی حیثیت سے نظم و نسق میں اس زبان کے موجودہ استعمال کو برقرار رکھنے کے حامی ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر سنگا ریڈی نے جلسہ کی صدارت کی۔ ابتدا میں صدر انجمن اولیائے طلبہ نے مسٹر باگا ریڈی کی قومی و سماجی خدمات کی ستائش کی۔

اُردو رائٹرس کوآپریٹیو پبلشنگ سوسائٹی ناگرکرنول

آندھرا پردیش اُردو رائٹرس کوآپریٹیو پبلشنگ سوسائٹی حیدرآباد کی رکنیت سازی اور مستقر ناگرکرنول پر اس کی شاخ کے قیام کے سلسلے میں اُردو شاعروں اور ادیبوں کا ایک اجتماع مسٹر احمد بن علی صدر انجمن ترقی اُردو کی صدارت میں اردو کالج ناگرکرنول میں منعقد ہوا۔ مسٹر فاروق راہی نے اس اجتماع کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی اور "اردو مجلس" کے قیام کی تجویز پیش کی۔ ابوالحسن ترکی کو معتمد اُردو مجلس منتخب کر لیا گیا۔ اُردو مجلس کی جانب سے مسٹر فاروق راہی کو محبوب نگر کے شعرا اور ادیبوں کا تذکرہ ترتیب دینے کی ہدایت کی گئی۔ اُردو رائٹرس کوآپریٹیو پبلشنگ سوسائٹی کے اغراض و مقاصد سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے مستقر ناگرکرنول پر اس کی شاخ کے قیام کی تجویز منظور کر لی گئی۔ مسٹر احمد بن علی، یعقوب علی یعقوب، محمد عثمان، مسرت نارائن اور فاروق راہی نے اس سوسائٹی کی رکنیت قبول کر لی۔ مسٹر مسعود بن احمد کے شکریہ پر اجتماع برخاست ہوا۔

"ادبی مجلس" نئی دہلی

دلّی کے نوجوان ادیبوں کی "ادبی مجلس" میں من موہن تلخ نے اپنی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا "شاعری انسان کے شخصی اظہار کا ایک حسین ذریعہ ہے جو زبان و بیان سے آراستہ ہو کر شعر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ شعر گوئی کے لیے یہ ضروری ہے کہ فنکار کی نس نس میں جمالیات کا احساس سرایت کر چکا ہو۔"

تلخ صاحب کے بعد اُردو کے نامور پاکستانی ادیب و نقاد ممتاز حسین نے موجودہ شاعری کے مختلف موضوعات پر نہایت مدلل اور بصیرت افروز تقریر کی۔

جلسے کی صدارت مسز راج رتن نے کی اور سکریٹری کے فرائض کیلاش ماہر نے انجام دیے۔ شرکت کرنے والوں میں ڈی ایم اے، کرشن موہن، بلراج حیرت، چندن، اندرجیت لال اور مشہور مصور جسونت سنگھ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو مجلس حیدرآباد کا ادبی اجلاس

اُردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی اجلاس ۲۹ر جولائی کو اُردو ہال واقع حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے شعبۂ اُردو کے نگراں، قاضی عیاذ انصاری صاحب نے "بول چال کی زبان" کے زیرِ عنوان اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ بول چال کی زبان کے ارتقائی مدارج پر تفصیلی روشنی ڈالی اور بول چال کی زبان کا اُردو شعر و ادب پر جو اثر مترتب ہوا ہے اُس کی کئی مثالیں دیں۔ (وقار خلیل)

ہندستان کے بارے میں نمائش

لینن گراڈ میں سوویت یونین کی سائنس اکاڈمی کی لائبریری میں ایک نمائش ہو رہی ہے جو آزادیٔ ہند کی پندرھویں سالگرہ سے متعلق ہے۔ یہاں ہندستان کی جد و جہد آزادی اور دورِ حاضر سے متعلق کتابیں، دستاویزیں اور تصویریں رکھی گئی ہیں۔ ہندستان کے اقتصادی ارتقا اور صنعتی ترقی کے علاوہ ہندستان کی امن پسند بیرونی پالیسی سے متعلق بھی بہت سی دستاویزیں نمائش میں رکھی گئی ہیں۔ لائبریری میں ہندستان سے متعلق بہت سی کتابیں اور رسالے ہیں، ہر سال ان چیزوں کی تین ہزار کاپیاں ہندستان سے آتی ہیں، ہندستان کے تیرہ علمی اداروں سے یہ لائبریری مطبوعات کا تبادلہ کرتی ہے۔ یہ چیزیں بھی نمائش میں رکھی گئی ہیں۔

مکتبۂ جامعہ

مہاراشٹر میں اُردو زبان کی ترقی و توسیع اور مقامی زبان سے مسلم بچوں میں مزید دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے مکتبۂ جامعہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایس ایس سی کے امتحان میں مراٹھی میں اول آنے والے مسلم طالب علم کو ایک میڈل دیا جائے، اور اردو میں اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کو بھی میڈل دیے جائیں۔

شاہد صدیقی کو خراجِ عقیدت

۵ر اگست کو اُردو ہال میں منعقدہ ایک بڑے اور نمائندہ اجتماع نے شاہد صدیقی کو ایک بڑے شاعر، صحافی، ادیب، طنز نگار اور ایک بہترین انسان کی حیثیت سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انجمن ترقی اردو اور اُردو مجلس کی جانب سے منعقدہ اس جلسۂ عام کی صدارت مسٹر پی وی نرسمہا راؤ وزیر اطلاعات و تعلقات عامہ نے کی۔ سارا ہال ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور شاہد صدیقی کے بے شمار دوستوں، پرستاروں اور چاہنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مسٹر پی وی نرسمہا راؤ نے شاہد صدیقی کو اُردو کے ایک بڑے شاعر اور ایک خوددار اور غیور انسان کی حیثیت سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ ان کا کلام اور ان کے آداب و اخلاق نئی نسل کے شاعروں کے لئے صحیح معنوں میں چراغِ منزل ثابت ہوں گے۔

انھوں نے کہا کہ دو چار دفعہ کی سرسری ملاقاتوں کے سوا انھیں نہ تو حضرت شاہد سے بے تکلفی اور قربت کا دعویٰ ہے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو شاہد جیسے بڑے شاعر کے کلام پر تنقید و تبصرہ کا اہل پاتے ہیں لیکن اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ دو چار دفعہ کی ان ملاقاتوں نے بھی شاہد کی بذلہ سنجی، خوش مزاجی اور اعلیٰ ذہنی تہذیب کا بڑا گہرا نقش ان کے دل پر چھوڑا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے چند دنوں سے اُردو اور اُردو کی منظومات سے ٹوٹے ہوئے ان کے ربط کو شاہد کی موت نے پھر ایک بار جاری کیا ہے اور اب انھیں توقع ہے کہ وہ اس خوبصورت زبان کے قابلِ فخر ادب سے اپنے رشتہ کو مضبوط و مستحکم بنا سکیں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اچھا ادب اور اچھی شاعری کسی ایک زبان کی میراث نہیں ہوتی بلکہ وہ بے شمار زبانیں بولنے والے دنیا کے ان تمام نیک دل انسانوں کا ورثہ بن جاتی ہیں جو سچائی اور حسن کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ صدر جلسہ کی حیثیت سے وزیر اطلاعات مسٹر نرسمہا راؤ نے قرار دادِ تعزیت بھی پیش کی۔

شاہد مرحوم کی بیوہ طاہرہ بانو کا ایک بے حد درد انگیز تاثر پڑھ کر سنایا گیا۔ طاہرہ بانو نے اپنی سولہ سالہ ازدواجی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اس مضمون میں بتایا تھا کہ آزمائشوں اور مصائب و آلام کے ہر مرحلہ پر کس طرح شاہد اپنی خودداری کی حفاظت کرتے رہے اور کس طرح کچی مٹی کی دیواروں اور کویلو کے گھر میں حضرت شاہد کا چراغِ منزل جلتا رہا۔ طاہرہ بانو نے اپنے اس مضمون میں شاہد کے کمرے کا خاکہ کھینچتے ہوئے بتایا تھا کہ دری پر بیٹھ کر حضرت شاہد نے تکئے پر ٹیک رکھے نہ جانے اپنی زندگی کی کتنی حسین غزلیں مکمل کی تھیں۔ انھوں نے سوگوارانِ محفل سے درخواست کی تھی کہ وہ اس عظیم انسان کی یاد میں نچھاور کئے جانے والے ان گنت آنسوؤں میں ایک مجبور و بے بس بیوہ کے چند اشک بھی شامل کر لیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ اپنی زندگی میں انھوں نے کبھی دو سطر لکھنے کی جسارت نہیں کی تھی لیکن آج یہ مضمون لکھ کر انھیں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے مرحوم نے اپنے قلم کی طاقت انھیں سونپ دی ہے۔

جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش نے کہا کہ شاہد صدیقی کس پایہ کے شاعر اور کس حیثیت کے نثر نگار تھے یہ باتیں تو نقادوں کے تبصرہ کی محتاج ہیں۔ میں شاہد کو انسان کی حیثیت سے کئی سال سے جانتا تھا۔ آج کے دور میں جبکہ آدمیوں سے انسانیت کم ہوتی جارہی ہے۔ شاہد کو میں نے ایک شریف انسان پایا گروہ بندی اور پارٹی بازی سے دور اور الگ تھلگ رہے۔ وہ ادیبوں کے ہر طبقے میں مقبول تھے۔

مخدوم محی الدین نے اپنے ۲۵ سالہ رفیق اور ساتھی شاہد صدیقی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ہمیشہ سب کو ہنسانے والی اس خوش گو اور خوش مزاج شخصیت کو آنسو بہاتے بھی دیکھا تھا۔ کچھ دنوں سے جیسے انھیں احساس ہو چلا تھا کہ ان کا انتقال ہونے والا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ اب زندگی سے جی بھر گیا ہے۔ اس دنیا میں اب جی نہیں لگتا۔ مخدوم نے بتایا کہ شاہد مثل شہنشاہ اکبر کے کہ اپنے ایک دوست راسپا تک کے کرداروں کو سامنے رکھ کر ہم طبقہ جاتی شادیوں کے موضوع پر ایک ناول لکھنا چاہتے تھے وہ ہندوستان کی تاریخ کے کئی حصوں کو منظوم کر چکے تھے اور غالباً ۲۰ ہزار اشعار مکمل کر چکے تھے۔ ۲۵ برس کی دوستی میں کبھی ان سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ کسی دوست یا محبوب شخصیت کے بارے میں علم اس کے ہجر و فراق یا اس کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد ہی ہوتا ہے اور ہم اس کی شخصیت کی تفصیلات پر غور کرتے ہیں۔ ہمیں شاہد صدیقی کی شاعری اور نثر کا از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا اور ہمیں اب ان کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ انھوں نے کہا کہ انسان کی زندگی معاشی اور سماجی حالات کے تحت بھی مختصر ہو جاتی ہے۔ شاہد صدیقی مسلسل معاشی پریشانیوں کے شکار رہے۔ اسی کی وجہ سے قبل از وقت سے پہلے ہم سے بچھڑ گئے۔

مسٹر محمد دوم محی الدین نے افسوس کا اظہار کیا کہ شاہد صدیقی کے انتقال پر معظم جاہ نے اپنے تاثرات کا اظہار نہیں کیا حالانکہ شاہد صدیقی ان کی محفلِ شعر و سخن میں شریک ہوا کرتے تھے۔

راے جانکی پرشاد صدر اُردو مجلس نے اُردو مجلس کی طرف سے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ شہریار کاوس جی نے کہا کہ ایک آدمی میں اتنی ساری خصوصیات کا جمع ہو جانا بہت کم دیکھا جاتا ہے وہ اچھے شاعر ادیب اور اچھے مقرر تھے۔ ان سے گفتگو کرنے سے ہمیشہ خوشی اور مسرت کا احساس ہوتا تھا وہ ایک بہترین دوست اور اچھے انسان تھے۔ علامہ حیرت بدایونی نے رقت آمیز لہجہ میں پُر اثر تقریر کی اور شاہد صدیقی کی مختلف خوبیوں اور صفات کا ذکر کیا۔ مسٹر عالم خوند میری نے کہا کہ ہمیشہ مسکرانے اور قہقہہ بکھیرتے رہنے والے اس شاعر کو زندگی کے حزنیہ کا پورا پورا عرفان بھی تھا۔ وہ اپنی مصیبتوں پر ہنستا تھا۔ سلیمان اریب، مرزا شکور بیگ، طالب رزاقی، بانو طاہرہ سعید، روحی علی اصغر، ابن احمد تاب، اعجاز قریشی، صلاح الدین نیر، برق موسوی اور دوسرے شعراء نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

مراسلہ

اُردو میں صوتیاتی اصطلاحیں

مورخہ ۸ر فروری ۶۲ء کے ہماری زبان میں "اُردو میں صوتیاتی اصطلاحوں" پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا تبصرہ نظر افروز ہوا۔ موصوف نے میرے لئے جو ستائشی الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے لئے میں مشکور ہوں حالانکہ میں ان کا مستحق کسی طرح نہیں۔ فی الحال چند دوسرے مشاہدات کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کرنا ہے۔ مجھے قطعاً اصرار نہیں کہ میری پیش کردہ تمام اصطلاحیں جوں کی توں قبول کر لی جائیں۔ ۔ ۔ محض غور و فکر کے لئے چند بنیادی امور بیان کیا چاہتا ہوں کہ اہل نظر ان کی خامیاں آشکارا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا نعم البدل بھی تجویز کرتے چلیں تاکہ میری رہبری ہو۔

دنیا میں صوتیات کا علم اس طرح عام نہیں جیسے فزکس کیمسٹری یا انجینئرنگ کا۔ یہ محض خواص تک محدود ہے۔ جہاں تک اُردو کا تعلق ہے صوتیات کے جاننے والے انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے ہیں پانچ سات نہیں تو آٹھ دس ہوں گے اور اس شمار میں مجھ جیسے ہیچمداں بھی شامل ہیں۔ صوتیات کی اصطلاحیں ایک کتاب اور تین چار مضامین میں ملتی ہیں اور بس۔ اس صورت میں ہم ابھی اس منزل پر نہیں پہنچے جہاں یہ کہہ کر اصولوں اور شعوری کوششوں سے چشم پوشی کرسکیں کہ فلاں اصطلاح گو غلط سہی لیکن استعمال عام میں آ گئی ہے اس کا چلن ہو گیا ہے۔ اس استعمال عام اور چلن کی حقیقت دو یا تین تحریروں سے زیادہ نہیں۔ یہ ایک زرّیں موقع اور مبارک منزل ہے کہ ہم ناقص اصطلاحوں کے کثرت استعمال کے پیرِ تسمہ پا کی گرفت میں نہیں۔ ہمارے لئے گنجائش ہے کہ ہم غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد مناسب اصطلاحوں کا تعین کریں۔

اصطلاحوں کے سلسلے میں ایک اصول پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب ہم کسی انگریزی اصطلاح کا اُردو ترجمہ کریں تو کوشش ہونی چاہئے کہ اُردو لفظ حتی الامکان اصطلاحی مفہوم کی بیش از بیش صحت کے ساتھ ترجمانی کرے۔ ابھی محض ابتدائے عشق ہے۔ اگر کوئی غلط لفظ اختیار کر لیا تو ثریا تک دیوار کج جائے گی۔ حرف صحیح اور حرف علت سے زیادہ عام فہم اور عالمگیر کون سی اصطلاحیں ہوں گی لیکن محض صحت کی خاطر انھیں مصمتہ اور مصوتہ کہا گیا اور انھیں نارنگ صاحب نے بھی لبیک کہا۔

موصوف لکھتے ہیں کہ "voiced اور voiceless کے لئے جب اُردو میں اکثر و بیشتر مسموع اور غیر مسموع استعمال ہوتے ہیں اور یہ اصطلاحیں چل نکلی ہیں اور مفہوم کو بھی ظاہر کرتی ہیں تو خفی اور جلی کی کیا ضرورت ہے۔" غرض یہ ہے کہ مسموع اور غیر مسموع کی اصطلاحیں میرے علم میں صرف دو مضامین میں ملتی ہیں، اوّل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مقالہ "اُردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو" جو بعد میں اُردوئے معلیٰ میں بھی شامل ہوا۔ دوم ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مضمون مشمولہ اُردوئے معلیٰ۔ میں نے جس وقت اپنا مضمون ہماری زبان میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا اس وقت تک یہ دونوں مقالے منظر عام پر آئے بھی نہ تھے۔

اس وقت تک voiced اور voiceless کے لئے سروری صاحب نے مصبتی اور غیر مصبتی، چودھری محمد نعیم[1] نے نفسی اور غیر نفسی اور سرسوتی سرن کیف[2] صاحب نے اپنے مضمون (ہندوستانی صوتیات نیا دور مارچ ۱۹۶۱ء) میں مظہر اور مہموس کی اصطلاحیں استعمال کی تھیں۔ مسموع اور غیر مسموع کے چل نکلنے کی کیفیت تو یہ ہے۔ اب ان کے مفہوم پر غور کیجئے پ۔ ت۔ ٹ۔ ک۔ چ۔ ف وغیرہ voiceless آوازیں ہیں۔ غیر مسموع کے معنی ہیں جو سنی نہ گئی ہوں۔ یہ مفہوم ان آوازوں پر کہاں تک دلالت کرتا ہے۔ voiced اور voiceless میں جو نازک فرق ہے وہ خفی اور جلی سے بخوبی ادا ہوتا ہے۔

aspirated اور unaspirated کے لئے ڈاکٹر زور نے نفسی اور غیر نفسی (ہندوستانی لسانیات۔ جدید ایڈیشن ص ۱۱۳)، سروری صاحب نے اول الذکر کے لئے تنفسی (زبان اور علم زبان ص ۲۸)۔ سرسوتی سرن کیف اور راقم الحروف نے منفوس اور مقلول استعمال کئے ہیں۔ منفوس نفسی ہی کی بہتر شکل ہے۔ سروری صاحب نے نفسی کے علاوہ "ہ کار" اور غیر "ہ کار" کا استعمال کیا ہے جس کی تقلید چودھری نعیم، ڈاکٹر نارنگ، اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کی۔ "ہ کاری" ہندی ترکیب معلوم ہوتی ہے لیکن ہندی میں اس کا پتہ نہیں۔ منفوس aspirated کا صحیح ترجمہ ہے۔ فاضل تبصرہ نگار منفوس اور مقلول کو غریب اور دقیق قرار دیتے ہیں حالانکہ 'نفس' اور 'قلیل' اُردو والوں کے لئے عام الفاظ ہیں لیکن وہ اپنی اصطلاحوں غشائی اور لہاتی[3] (میری زبان میں نرم تالوئی اور پیش حلقی) کو کیا کہیں گے جن کے معنی اُردو لغات میں نہ ملنے پر مجھے عربی لغات کا سہارا لینا پڑا۔

affricate کے لئے میرا ترجمہ قابل تشفی نہیں لیکن مجھے اس کے لئے اُردو کے کسی مضمون یا کتاب میں کوئی اصطلاح نہیں ملی۔ میرا ترجمہ مجبوری کا سودا ہے۔ لثہ مسوڑھے کے لئے الازہر کی اصطلاح ہے۔ اُردو میں اس کے لئے ایک لفظ دانت بیٹھک دیکھنے میں آیا جو مجھے پسند نہیں۔ دوسرے لکھنے والے اس اصطلاح کو اڑا ہی گئے ہیں۔ انھوں نے لثوی اور دنتی آوازوں میں کوئی فرق ہی نہیں کیا۔

میں نے trilled کا ترجمہ لرزشی کیا تھا۔ نارنگ صاحب کے مضمون میں اس کے لئے 'ارتعاشی' بہتر اصطلاح ہے جسے میں قبول کرتا ہوں۔

مجھے تسلیم کہ "دہقانیت کی حد تک دیسی بولی" لسانی طریقۂ طلبہ نہیں لیکن اس سے میرا منشا ادا ہو گیا کہ دانت بیٹھکی، رگڑ والا اور ٹھپک وار قسم کی اصطلاحیں ساقط المعیار ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صوتیاتی اصطلاحیں کسی دوسرے کو کب سو فی صدی آسودہ کر سکتی ہیں جب کہ خود مضمون نگار کو ان سے تشفی نہیں ہوتی۔ اسی لئے تو اور بھی ضروری ہے کہ کوئی ادارہ پیش قدمی کرکے ایک کمیٹی کے ذریعے اصطلاحیں مرتب کرائے۔

(گیان چند)

---

[1] اُردو ادب دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۱۰۱

[2] ہندوستانی صوتیات نیا دور مارچ ۱۹۶۱ء

[3] اُردوئے معلیٰ لسانیات نمبر ص ۲۲۴

ضیاء احمد بدایونی

تبصرے

کاروان غزل

مصنفہ باسط بھوپالی۔
ملنے کا پتا۔ مکتبہ شرقیہ۔ ابراہیم پورہ۔ بھوپال۔
قیمت۔ تین روپے۔

یہ جناب باسط بھوپالی کی اڑتیس سالہ شاعرانہ کاوش کا نتیجہ ہے۔ اور ان کی غزلیات۔ تضمینات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری رسمی شاعری نہیں ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے خود محسوس کرکے لکھا ہے ان کے یہاں شعر برائے شعر نہیں بلکہ بقول خود ایک مقصدیت ہے جو اکثر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ خوبی یہ ہے کہ حتی الامکان انھوں نے شعریت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

ایک اچھے شاعر کے لئے ضروری ہے کہ مواد کے ساتھ ہیئت کا بھی پورے طور پر خیال رکھے۔ ان دونوں میں سے اگر کسی ایک کو بھی نظر انداز کر دیا تو شعر معیار سے گر جائے گا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ باسط صاحب کے یہاں فنی تسامحات نہ ہونے کی برابر ہیں صفحہ ۸۰ پر ہے "ستم کی اہمیت کم ہو گئی ہے"۔ اہمیت بروزن فاعلن صحیح نہیں ہے۔ بروزن مفاعلن یا مفاعیلن ہونا چاہئے۔ صفحہ ۱۰۹ پر تاب سفر بھی محل نظر ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۲۴ پر جو غزل ہے اس کی بحر میں تصرف۔ اور غزل کے مطلع اور دوسرے اشعار میں وزن کا فرق نہ ہونا چاہئے تھا۔ تاہم ان جزوی کمزوریوں سے دیوان کی خوبی پر حرف نہیں آتا۔

گلدستۂ قرآن وحدیث

مرتبہ ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی۔
ملنے کا پتا۔ بازار نور الامراء۔ حیدرآباد دکن نمبر ۲۴۔
قیمت۔ ایک روپیہ۔

قاری صاحب موصوف جو سابق صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ ہیں برابر علمی ودینی خدمات میں لگے رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے قرآن مجید اور حدیث نبوی سے ضروریات زمانہ کے مطابق مختصر آیتیں اور جملے لے کر مع ترجمہ و تشریح جمع کر دیے ہیں تاکہ مسلمان بچے ان کو یاد کرلیں۔ اور ان کو مذہب سے لگاؤ پیدا ہو جائے۔ یہ مجموعہ نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کے لئے بھی ہر طرح مفید ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مسلمان گھرانوں میں اس کی پوری طرح پذیرائی ہوگی۔ اگر آیات و احادیث میں اتحاد موضوع کی رعایت رکھی جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔

سہل تجوید

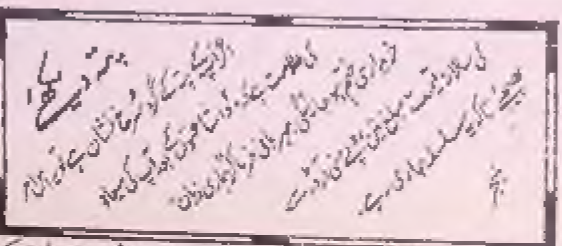
از مولف مذکور الصدر۔
ملنے کا پتہ۔ الحاج قاری عبدالرحیم صاحب، قریب گیٹ محلہ بلدیہ، بازار نور الامراء۔ حیدرآباد دکن نمبر ۲۴۔
قیمت۔ ۷۵ نئے پیسے۔

تجوید پر یہ کتابچہ بھی قاری کلیم اللہ صاحب کا مرتبہ ہے۔ عام رسالوں سے مختصر اور سہل تر۔ جس میں مثالوں اور نقشوں کی مدد سے تجوید کے قاعدوں کو سمجھایا گیا ہے۔ فن تجوید سے حروف کے مخارج اور ان کی صفات کا علم ہوتا اور قاری کو صحیح طور سے حروف کے ادا کرنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن حکیم کے پڑھنے کے لئے تجوید جس قدر ضروری ہے ظاہر ہے۔ فاضل مرتب نے تجوید کے مشکل مسائل کو نہایت عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ اور ہر سبق کے آخر میں طلبہ کے فائدے کے لئے سوالات دے دئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر کوئی شخص ان قاعدوں کو استاد سے سمجھ کر یاد کرلے تو تھوڑی مدت میں قاری بن سکتا ہے۔

ترتیل القرآن

مولفہ خدیجہ بنت سیدنا طاہر سیف الدین صاحب۔
پتا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ جے جے اسپتال۔ بمبئی نمبر ۳۔ قیمت درج نہیں۔

یہ رسالہ بھی جو الادارۃ الثقافیہ العلمیہ بمبئی کی طرف سے پہلی پیش کش ہے فن تجوید سے متعلق ہے۔ اور اختصار کے باوجود فن کے ضروری ابتدائی مسائل پر حاوی۔ انداز بیان آسان اور عام فہم ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ادارہ مذکور اس رسالے کو گجراتی میں بھی (بخط گجراتی۔ نیز بخط عربی) شائع کر رہا ہے۔



پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپواکر مرکزی انجمن سے شائع کیا